"نولکھی کوٹھی" مقبوض معاشرتی نظام کا نوحہ گر۔ تنقیدی جائزہ

"Nolkhi Kothi": Lament of the Occupied Social System A Critical Review

Uzma Noreen
uzmanoreengcwus@gmail.com
Lecturer, Urdu Department, GCW University, Sialkot, Pakistan
Imama Riasat
Imamariasat786@gmail.com
Ph.D Scholar Urdu, Northern University, Nowshera, Pakistan
Muhammad Mohsin Khalid
mohsinkhalid53@gmail.com
Lecturer, Urdu Department, Govt. Shah Hussain Associate College, Lahore, Pakistan

KEYWORDS

Partition
Social System
Despotism
Feudalism
Civilization
Migration
caste system

DATES

Received	**15-07-2022**
Accepted	**15-08-2022**
Published	**20-09-2022**

QR CODE

ABSTRACT

This paper is about the social system under English rule before partition. The British government ruled the subcontinent for one hundred and fifty years. During this time, the entire social system of the subcontinent was destroyed, which badly damaged the concept of orientalism. In this paper, Ali Akbar Natiq's novel "Nolkhi Kothi" is critically evaluated, which shows how the British, for the sake of their own interests, changed the centuries-old social system of subcontinent with their hypocritical thinking, policies, and practices. changed from and left indelible impressions of their culture and Bodo bash on it. This paper also covers the post-partition social situation, in which there is a mention of the unrest, hatred, self-interest, and cultural decline that arose as a result of the partition.

DOI:
http://journals.mehkaa.com/index.php/negotiations/article/view/83

تلخیص:

یہ مقالہ تقسیم سے قبل انگریزی عمل داری کے ماتحت معاشرتی نظام کے بارے میں ہے۔ برصغیر میں انگریز حکومت نے ڈیڑھ سو برس حکومت کی۔ اس دوران برصغیر کی جملہ معاشرتی نظام کی توڑ پھوڑ ہوئی جس نے مشرقیت کے تصور کو بری طرح پامال کیا۔ اس مقالہ میں علی اکبر ناطق کے ناول "نو لکھی کوٹھی" کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انگریزوں نے اپنے مفاد کی خاطر برصفیر کے صدیوں سے جمے ہوئے نظامِ معاشرت کو کس طرح اپنی منافقانہ سوچ، پالیسوں اور عمل داری سے بدلا اور اس پر اپنی تہذیب اور بود و باش کے انمٹ نقوش ثبت کیے۔ یہ مقالہ تقسیم کے بعد کی معاشرتی صورتحال کا بھی احاطہ کرتا ہے جس میں تقسیم کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بدامنی، منافرت، ذاتی مفاد اور تہذیبی تنزل کا تذکرہ موجود ہے۔

علی اکبر ناطق کی پیدائش پاکستان کے شہر اوکاڑہ کے نوحی گاؤں 32 ٹو ایل میں 1977ء میں ہوئی۔ ان کا خاندان 1947ء کے فسادات کے دوران فیروز پور ہندوستان سے ہجرت کر کے وسطی پنجاب کے شہر اوکاڑہ کے گاؤں 32 ٹو ایل میں آباد ہوا تھا۔ یہ گاؤں انگریزوں کے دور میں مثالی حیثیت رکھتا تھا۔ حالات کی خرابی کی وجہ سے علی اکبر ناطق نے تعلیم کے ساتھ ساتھ مزدوری کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور بطور مزدور پندرہ سال تک کام کیا۔ اس دوران ان کا اردو نثر، شاعری، تاریخ اور سماج کا مطالعہ بھی جاری رہا۔ 1998ء میں وہ مزدوری کے سلسلے میں کچھ عرصہ کے لیے مڈل ایسٹ اور سعودی عرب بھی رہے۔ اس سفر کے دوران علی اکبر ناطق نے نہ صرف بہت کچھ سیکھا بلکہ "معمار کے ہاتھ" کے عنوان سے ایک افسانہ بھی لکھا جو بہت مشہور ہوا اور جس کا انگریزی میں ترجمہ محمد حنیف نے کیا جو امریکہ کے مشہور ادبی رسالے "گرانٹا" میں شائع ہوا۔

علی اکبر ناطق کی صبر و استقامت، بلند حوصلے اور ثابت قدمی نے انھیں 2009ء میں ادبی طور پر اس وقت دنیا کے سامنے اچانک ابھارا جب کراچی کے ایک موقر ادبی رسالے "دنیازاد" نے ان کی دس نظمیں اور ادبی رسالے "آج" نے پانچ افسانے چھاپ دیئے یوں ناطق کی تخلیقات کے اچھوتے و نرالے پن نے نہ صرف ادبی حلقوں میں ہل چل مچادی بلکہ لوگوں کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ 2010 میں علی اکبر ناطق کا پہلا شعری مجموعہ "بے یقین بستیوں میں" کے نام سے "آج" کراچی سے چھپا اور یو بی ایل کے ساتھ ساتھ "آکسفورڈ ایوارڈ" کے لیے بھی نامزد ہوا جب کہ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 2012 میں "قائم دین" کے نام سے منظر عام پر آیا جسے آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس نے شائع کیا اور اس کتاب کو بھی "یو بی ایل" اور "آکسفورڈ ایوارڈ" کے لیے نامزد کیا گیا۔

ناطق کا دوسرا شعری مجموعہ 2013ء میں "یاقوت کے ورک" کے نام سے "آج" کراچی کی جانب سے چھپا اور اس کے علاوہ دوسرا افسانوی مجموعہ جس کا نام ہے "شاہ محمد کا تانگا" اسے 2017ء میں سانجھ پبلی کیشنز لاہور سے چھاپا گیا۔ علی اکبر ناطق کی

تمام ہی کتب کو انگریزی اور جرمن زبانوں میں ترجمہ کر کے پنگوئن انڈیا نے بھی شائع کیا۔ ان کے کچھ افسانوں پر تھیٹر ڈرامے بھی بنے جو پر تھوی تھیٹر بمبئی ہندوستان میں دکھائے گئے ہیں۔

علی اکبر ناطق صرف ایک قابل قدر اور معتبر افسانہ نگار شاعر ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے ناول "نولکھی کوٹھی" نے انھیں مایہ ناز ناول نویسوں کی صف میں بھی لا کھڑا کیا ہے۔ ان کا یہ ناول پہلی مرتبہ 2014ء میں منظر عام پر آیا جسے سانجھ پبلی کیشنز نے شائع کیا اور اب تک اس ناول کو بالترتیب 2014ء، 2015، 2018، اور 2019 پانچ مرتبہ شائع کیا جا چکا ہے۔ اس مقالہ میں مصنف کے ناول "نولکھی کوٹھی" میں پیش کئے گئے معاشرتی مسائل کو زیر بحث لایا جائے گا۔ اس ناول کا موضوع ان تمام ناولوں سے ہٹ کر ہے جو پاکستان بننے کے بعد سے لے کر آج تک لکھے گئے۔

اس ناول کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ دیگر ناولوں کی طرح اس کا موضوع "ہندو مسلمان" روایتی دشمنی نہیں ہے بلکہ اس کی کہانی انگریز دور کی ایسٹ انڈیا کمپنی سے شروع ہوتے ہوئے ہندوستان کی خوبصورتی، تقسیم ہند کے فسادات کی جھلک دکھاتی ہوئی ضیا دور تک قارئین کو کھینچ لاتی ہے۔ علاوہ ازیں اس میں جو علاقہ موضوع گفتگو بنایا گیا ہے وہ غیر منقسم پنجاب کا وسط یعنی فیروز پور تحصیل جلال آباد ہے جو کہ اب بھارت کا حصہ ہے۔

یہ ناول 432 صفحات پر مشتمل ہے اور اس کے کسی کردار کو بھی ضمنی کردار کے حوالے سے نہیں دیکھا جا سکتا کیوں کہ ناول کے تمام ہی کردار اپنے اپنے وجود میں اہم کہانیاں سمیٹے ہوئے ہیں البتہ ولیم، غلام حیدر، سودھا سنگھ، مولوی کرامت وغیرہ کے ذریعے ناول کی کہانی سلسلہ بہ سلسلہ چلتی ہوئی بہت سے مراحل طے کرتی اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔ چوں کہ ناول کا موضوع اپنے آغاز میں ہندوستان کے خطے سے تعلق رکھتا ہے لہذا مصنف نے اس کی شروعات میں نہ صرف ہندوستان کی خوبصورتی کو بیان کیا بلکہ ولیم کے ذریعے انگریزوں کی اس سوچ کو بھی آشکارہ کیا جو وہ ہندوستانیوں کے لیے رکھتے تھے۔ ناول کی ابتدا ولیم کے ہندوستان آنے سے کی گئی ہے جو انگلستان سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد فیروز پور کی تحصیل جلال آباد میں بطور اسسٹنٹ کمشنر تعینات کیا گیا تھا۔ ناول نگار نے ہندوستانی اور مغربی معاشرہ کے درمیان پائے جانے والے فرق کو نمایاں کرتے ہوئے اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ انگریز لوگ اپنا ہر کام خود کرتے ہیں۔

اس معاشرے کی ترقی کا راز ہی محنت ہے۔ نوکر چاکر، ملازمائیں، خادمائیں، مالی، باورچی اور اسی طرح کے اور بہت سے ملازم رکھ کر خود عیاشی کی زندگی بسر کرنے کا مغربی معاشرے میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جب کہ ہندوستانی معاشرہ اس قسم کے آرام و آسائشوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انگریز لوگ تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے اور یہاں قبضہ کرنے کے بعد مختلف بڑے عہدوں پر فائز ہوئے تو ان کے گھروں میں ان کے بچوں اور بیویوں کی دیکھ بھال اور دیگر امور کو سرانجام دینے کے لیے ملازمین کی پوری فوج رکھی جاتی جو کہ دیسی لوگوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہندوستانی

انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے اوراپنے بہت سے کاموں کو نکلوانے کے چکر میں نہ صرف انگریز افسروں کے سامنے بچھ بچھ جاتے تھے بلکہ بہت سے تحفے تحائف بھی انھیں دیتے رہتے تھے۔

ہندوستان کے رنگ بدلتے مختلف موسم، فصلوں سے بھرے کھیت پھلوں سے لہراتے درخت، سرسبز میدان، مرغ، بٹیروں اور تیتروں وغیرہ کا شکار یہ تمام چیزیں وہ تھیں کہ جن کے سحر نے نہ صرف ولیم کے دادا بلکہ باپ اور پھر ولیم کو بھی جکڑ لیا جس کے سبب وہ تقسیم ہند کے بعد بھی انگلستان جانے پر راضی نہ ہوئے اور یہیں کی مٹی میں دفن ہوگئے۔ ناول میں دیسی ملازمین کی خدمت گزاریوں کا حال ناول "نولکھی کوٹھی" سے لیے گئے اس اقتباس میں دیکھیے:

> "آنکھوں کے پردوں پر وسطی پنجاب کی یادیں تصویریں بناتی چلی گئیں۔ مال روڈ پر موجود پُر آسائش بنگلہ، مامائیں، خادم اور دیگر ملازموں کی فوج ایک ایک کر کے یاد آنے لگی۔ آٹھ سال کا عرصہ کم نہیں تھا جب وہ اپنے ماں، باپ اور گھر سے دور انگلستان کی اکتا دینے والی تعلیم اور ٹھٹھرا دینے والی سردی کے گھوروں میں انتظار کاٹتا رہا اور لڑکپن کی ہواؤں کو تصور میں لاتا رہا مامائیں کس طرح بابا لوگوں کو اپنے حصار میں لیے لارنس باغ میں آتیں۔ جب وہ اپنے والد کے ساتھ ان کے دفتر جاتا تو کس طرح آفس میں کام کرنے والا عملہ خوشامد کو آگے بڑھتا۔ چاکلیٹ اور عمدہ مٹھائیوں کے ڈھیر لگ جاتے حتیٰ کہ اس دن آدھا دفتر سب کام چھوڑ کر اس فکر میں ہولیتا کہ وہ بابا لوگ کی خوشی حاصل کرلے۔ ایسے ایسے پھل جن کی یورپ میں مہک تک نہیں پہنچتی۔ بنگلے کے ڈرائنگ روم میں پڑے سوکھا کرتے۔ نہ کوئی فکر نہ فاقہ۔"[1]

ناول "نولکھی کوٹھی" میں مصنف نے ولیم کے کردار کی وساطت سے ہندوستان میں انگریز افسروں کے انداز حکمرانی کو عیاں کیا ہے۔ یہ لوگ کالے لوگوں یعنی ہندوستانیوں کو ان کی غربت، جہالت اور تعلیم کی کمی کے سبب منہ لگانا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کے علاوہ خاص طور پر ہندو مسلم دشمنی سے ہٹ کر ناول نگار نے قیام پاکستان سے قبل مسلمانوں اور سکھوں کی دشمنیوں کو موضوع گفتگو بنایا ہے اوراس ضمن میں فیروزپور اوراس کی تحصیل جلال آباد کے رہنے والے مسلمان گھرانے اور سکھ گھرانے کو پیش کیا ہے۔

شیر حیدر جو کہ جلال آباد کے تین گاؤں کا مالک تھا وہ برصغیر کے ان جاگیرداروں اورزمینداروں کی نمائندگی کرتا ہے جن کے ڈیروں پر ہر وقت تیس سے چالیس آدمی ڈانگ برچھی سے لیس کسی بھی قسم کے خطرے سے نمٹنے کے لیے تیار رہتے ہیں لیکن خود سے کسی بھی لڑائی میں پہل نہیں کرتے بلکہ صلح صفائی اورامن وسکون سے رہنا پسند کرتے ہیں اور بے وجہ کی دشمنیاں بھی نہیں پالتے اور نہ ہی انگریز افسروں کی جی حضوری کے قائل تھے اوراس کے ساتھ ساتھ اپنی رعایا کے لیے بھی کسی فرشتے سے کم نہ تھے۔

اس کے برعکس سودھا سنگھ ان وڈیروں کی نمائندگی کرتا ہے جو اپنے آباؤ اجداد کی طرف سے ملنے والی نسل در نسل دشمنیاں نہ صرف پورے جوش سے نبھاتے ہیں بلکہ خواہ مخواہ چلتی ہواؤں سے بھی پنگے لیتے ہیں اوراس مقصد کے لیے وہ دیگر حریفوں کو بھی ساتھ ملاتے ہیں۔ اس ناول میں شیر حیدر اور سودھا سنگھ دونوں آپس کی کوئی ذاتی دشمنی نہیں رکھتے بلکہ یہ حسد و رقابت جو سودھا سنگھ کی طرف سے زیادہ وسیع وپائیدار ہے اپنے پرکھوں کے درمیان کبڈی کے میچ کے ہار جانے کی وجہ سے نسل در نسل چلاتے آرہے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں بھی بے شمار ایسے گھرانے موجود ہیں جو بہ ظاہر توصلح کر کے امن وامان سے رہتے ہیں لیکن پس پردہ بدلہ لینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور عین اس وقت اپنے مخالف پر حملہ کرتے ہیں جب وہ کسی غیر متوقع صورتحال کی وجہ سے مقابلے کے لیے تیار نہیں ہوتا بالکل جیسے سردار سودھا سنگھ نے غلام حیدر پر اس وقت حملہ کیا جب وہ اپنے باپ شیر حیدر کی وفات کے غم میں تھا حالانکہ شیر حیدر معاشرے کے پڑھے لکھے، تعلیم یافتہ اورایسے طبقے سے تعلق رکھتا ہے کہ جس کے باپ نے اسے خاندانی دشمنیوں سے کوسوں دور رکھا۔

مصنف نے ان دونوں خاندانوں کے توسط سے معاشرے میں پائے جانے والی ان خاندانی دشمنیوں کی تلخ حقیقت کو بیان کیا ہے جس کے تحت ہر روز قتل وغارت کے قصے ہونا معمول کی بات ہے۔ ان وراثتی دشمنیوں کی وجہ سے پورے پورے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں اور پولیس کچھ نہیں کر سکتی کیوں کہ یہ تو نہ ختم ہونے والا وہ سلسلہ ہے کہ جسے شاید نئی آنے والی نسل تو ختم کر دے مگر ان کے گرد بسنے والے جگبیر، پیت، بیدا اورانھی جیسے اور بہت سے لوگ ختم نہیں کر سکتے کیوں کہ یہ وہ لوگ ہیں جو بڑے سرداروں کے گرد بیٹھ کر نہ صرف ان کی پیٹھ تھپکتے ہیں بلکہ لڑائی جھگڑے کے لیے اکساتے بھی ہیں۔ اس ضمن میں ناول "نولکھی کوٹھی" کا یہ حصہ ملاحظہ کیجیے:

> "سودھا سنگھ نے جگبیر سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی بات شروع کی جو پہلے ہی سے اس انتظار میں تھا کہ کب سودھا سنگھ اس سے اصل بات کی طرف آتا ہے۔ پیت سنگھ جس کے سر کے بال گھنے ہونے کے ساتھ ڈب کھڑبے بھی ہو چکے تھے اس نے اپنے زانوں پر ہاتھ رکھ کر گفتگو میں حصہ لیا، سردار سودھا سنگھ منڈے کو سر ہی نہ اٹھانے دو۔ میرے تو جی میں ساہ اس وقت آئے گا جب شیر حیدر کے منڈے کو فلانگ کر دے گے۔ ابھی پیتا سنگھ بول ہی رہا تھا کہ بیچ سے بیدا سردار سنگھ نے اس کی بات کاٹ کر کہا سردار سودھا سنگھ! میری کرپان تو بڑے ورھوں سے پیاسی ہے۔ واہگرو جانتا ہے میں نے اس دن کے لیے کتنی منتیں مانیں۔ روز اس کی دھار تیز کرتا ہوں۔ جب تک کسی مسلے کا لہو نہیں پی لیتی واہگرو کی سونہہ اسے چین نہیں ملے گی۔" 2

یورپیوں کے لیے ہندوستان ایک خزانہ تھا۔ یہاں کے کپڑوں اور قالینوں کے علاوہ مصالحہ جات کی بھی یورپ میں بڑی مانگ تھی اور جب انھوں نے یہ دیکھا کہ بے شک ہندوستان ساز وسامان، مال ودولت اور تہذیب وتمدن میں یورپ سے بہت آگے

لیکن جدید جنگی اسلحے میں بہت پیچھے ہے تو انھوں نے اس کی تجارت شروع کر دی چنانچہ انھوں نے برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے 1600ء میں ایک تجارتی کمپنی کا سنگ بنیاد رکھا کیوں کہ یہ لوگ ہندوستان جیسے امیر اور ترقی یافتہ ملک پر تسلط قائم کرنے کے لیے تڑپ رہے تھے اوران کی اس دیرینہ خواہش کو مزید تقویت اس وقت ملی جب پرتگیزی شہزادی کی شادی ایک انگریز بادشاہ سے ہوئی اور وہ جہیز میں بمبئی بھی لے آئی۔

کمپنی نے ہندوستان میں بھرپور لوٹ مار مچائی اور آہستہ آہستہ پورے ہندوستان کے مالک بن بیٹھے۔ اس طرح وہ ہندوستانی جو کل تک حاکم تھے آج انگریزوں کے محکوم بن چکے تھے۔ اس حوالے سے ناول ''نولکھی کوٹھی''میں ولیم اورڈپٹی کمشنر کی درمیان ہونے والی گفتگو قابل غور ہے:

> "ہیلے نے دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر آگے جھکتے ہوئے گفتگو دوبارہ شروع کی، ولیم تم ایک انگریز ہو۔ یہاں تمہاری حیثیت حاکم کی ہے۔ ہم یہاں کی زمین سے رومانس نہیں حکومت کرنے آئے ہیں۔ جیسا کہ مجھے معلوم ہوا ہے آپ کی شاعرانہ طبیعت آپ کو مشکل میں ڈال سکتی ہے۔ یہاں آپ کا وجود ایک برتر سطح پر ہے۔ اس لیے آپ پر کئی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ جو انگریز نوجوان برٹش سول سروس کو جوائن نہیں کرتے وہ ان حدود اور ذمہ داریوں سے ماوراہیں۔ ولیم حاکم اور محکوم میں ایک فاصلہ ہوتا ہے۔ اسے قائم رکھنا حاکم کی ذمہ داری ہے۔" 3

اہم بات یہ بھی ہے جو ناول نگار نے اس ناول میں عیاں کی ہے کہ بے شک انگریز ہندوستان پر قابض تو ہو گئے لیکن یہاں کے لوگ ان کے لیے ٹیڑھی کھیر ثابت ہوئے جن کے دماغوں پر بہر حال وہ قابو نہ کر سکے اور حکمرانی کے باوجود انھیں یہ خوف ستاتا رہتا تھا کہ کہیں وہ ہندو مسلمان جو انگریزوں کے وجود سے نالاں و متنفر ہیں وہ ان کے خلاف کوئی گھناؤنی چال چلنے اورانھیں بے تخت و تاج کرنے کے قابل نہ ہو جائیں۔

ولیم اپنے عہدے اور کرسی کے غرور میں غلام حیدر سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا اوراس کی شخصیت سے مرغوب ہونے کے باوجود اسے سرسری لیتا ہے لیکن جب مدمقابل غلام حیدر سیدھی اور صاف بات کرتا ہے تو ولیم کے ہوش و حواس اور عقل بھی دنگ رہ جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ناول ''نولکھی کوٹھی'' سے لیا گیا یہ حصہ قابل غور ہے:

> "رات تین بجے میرا ملازم چراغ دین قتل کر کے بیس ایکڑ مکئی کی فصل لوٹ لی گئی۔ ولیم کے لیے غلام حیدر کا رویہ قطعاً غیر یقینی تھا۔ اسے احساس نہیں تھا کہ دیسی لوگوں میں بھی اچانک کچھ ایسے نکل آئیں گے جن کے لہجے میں فولاد کی سختی اور سردی موجود ہو گی۔ پچھلے ڈیڑھ مہینے تک اسے ایسے کسی شخص کا سامنا نہیں ہوا تھا اور نہ ہی بچپن میں ایسا واقعہ رونما ہوا جس میں اس نے دیسی لوگوں کی خوشامدانہ عادات

کے علاوہ کوئی عادت دیکھی ہو۔ غلام حیدر سے اس سرسری ملاقات کے بعد اسے فوراً ہیلے کی وہ نصیحت یاد آگئی کہ ان کے سینگوں سے ہمیشہ دور رہنا۔ اسے یہ سوچ کر جھرجھری سی آگئی۔" 4؎

ناول کسی بھی معاشرے کی خوب تشریح کرتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جو بھی تبدیلیاں معاشرے میں ظہور پذیر ہوتی ہیں ان کی واضح جھلک اس عہد کے تحریر کردہ ناولوں میں پائی جاتی ہے۔ معاشرتی تبدیلوں کے وہ اثرات جو انسانی زندگی کو متاثر کرتے ہیں ناول نگار انھیں اپنے ناول کا موضوع بناتے ہیں چنانچہ ناول کا تعلق براہ راست زندگی اور اس کی حقیقت سے وابستہ ہوتا ہے۔

انگریز کے دور حکومت کے دوران ہندوستان کے تمام تر دیہاتی معاشرے کا معاشی نظام ابتری کا شکار ہو گیا اور ایسا کرنے میں خود انگریزوں کا ہاتھ تھا۔ اس سے قبل ہندوستان کی دیہی زندگی کا نظام محنت کی تقسیم کے مرہون منت تھا۔ قانون یہ تھا کہ ہر گاؤں کی زمین وہاں کے رہنے والے باشندوں کی مشترکہ ملکیت ہوتی تھی جس کا ٹیکس براہ راست حکومت کو ادا کر دیا جاتا تھا اور ہندوستان کا ہر گاؤں اپنی حیثیت میں خود کفیل تھا مگر برطانوی حکمرانوں نے اس نظام کی دھجیاں بکھیر دیں اور یوں صدیوں پر مشتمل دیہی معیشت تہس نہس ہو گئی۔

انگریزی حکومت کے چیلے جو مال گزاری وصول کرنے پر فائز تھے انھوں نے انگریزوں کی وفاداری نبھانے کا فائدہ یہ اٹھایا کہ وہ ان زمینوں کے مالک بن بیٹھے اور رشوت کا بازار گرم کر دیا۔ انھیں زمین، زمین سے حاصل شدہ پیداوار اور کاشتکاروں کی فلاح وبہبود اور فائدے نقصان سے کوئی مطلب نہ تھا۔ ساہوکاروں نے سود کا سخت نظام تو قائم کیا ہی لیکن انگریزی حکومت نے بھی کسانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔

انگریزوں نے تحصیل دار، پٹواری، مکھیا اور منشی وغیرہ کے نام سے نئے عہدے اور عہدیدار متعارف کروائے جو برطانوی سامراج کی خوشامد کر کے خود تو فائدے اٹھاتے لیکن ان کے ہاتھوں غریب کسانوں کا برا حال ہوتا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستانی کاشتکاروں کی زندگی کا معیار روز بہ روز تنزلی کا شکار ہونے لگا اور بے بسی ومایوسی نے ان کو تھکانا شروع کر دیا جس کی وجہ سے ان کے حوصلے جواب دینے لگے اور کم محنت کی وجہ سے پیداواری صلاحیت بھی کم ہو گئی اوپر سے ٹیکسوں کے سخت نظام نے تو کسانوں کی مت مار دی۔

ناول نگار نے اپنے اس ناول نولکھی کوٹھی میں زراعت کے شعبہ سے منسلک کافی مسائل اور مشکلات کا احاطہ کیا ہے جو صرف ہندوستانی معاشرہ ہی نہیں بلکہ پاکستانی معاشرہ اور اس کے کسان وکاشتکار، تاجر غرض یہ کہ ہر کوئی برداشت کر رہا ہے۔ ٹیکس کے نظام کی سختی کے باعث زمینوں کی فروخت کے سلسلہ میں کسانوں کو جن مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے اس حوالے سے ناول ''نولکھی کوٹھی'' کا یہ اقتباس قابل توجہ ہے:

"تم مالیات کے نظام میں پٹواری کے دخل اور زمین کی خرید و فروخت میں ٹیکس کو جتنا ہو سکے زیادہ فروغ دو۔ اگرچہ اس کے نفاذ کے معاملے میں آپ کو تمام ہدایات تحریری ہی وصول ہوں گی۔ لیکن ایسا ہوتا ہے کہ لوگ باہر ہی باہر زمین فروخت کر دیتے ہیں جس کا اندراج کاغذات میں نہیں ہوتا۔ ہوتا یہ ہے کہ نہری پانی کا مالیہ وہ ادا کرنا شروع کر دیتا ہے جس نے زمین مول لی ہوتی ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ زمین خود بخود مالیہ ادا کرنے والے کے نام ہو جاتی ہے جو عموماً بنیا ہوتا ہے۔ ہم اس نظام کو مشکل بنا رہے ہیں اور ہر حالت میں زمین خریدنے والے پر بھاری ٹیکس لگا رہے ہیں۔ وہ کسی بھی صورت میں بغیر گورنمنٹ کو ٹیکس دیئے زمین اپنے نام نہیں کروا سکتا۔" 5

ناول میں بھی اس حوالے سے ولیم کے ماں باپ کا رویہ دیکھا جا سکتا ہے کہ جب وہ ولیم کو ہندوستانی لوگوں سے دور رہنے کا کہتے ہیں۔ ولیم ایک ایسا انگریز نوجوان آفیسر تھا جو ہندوستان سے سچی محبت کرتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ جگہ اس کی جنم بھومی تھی۔ لہٰذا بہت کوشش کے باوجود بھی وہ خود پر روایتی انگریز افسر کا لبادہ نہ اوڑھ سکا اور ان کی فلاح و بہبود اور بہتری کے کاموں میں دلچسپی لینے لگا جس پر نہ صرف اس کے افسران بالا نے اسے سرزنش کی بلکہ والدین کی طرف سے بھی روکا ٹوکا گیا اور یہ کہا گیا کہ وہ کالے لوگوں کو زیادہ منہ کیوں لگاتا ہے اور ان کے قریب آنے کی کوشش کیوں کرتا ہے۔

ولیم جب چھٹیاں گزارنے گھر آیا اور اپنے والدین کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ دیسی لوگوں کی اچھی تعلیم و تربیت کے لیے اسکول کھولنا چاہتا ہے تو ذرا دیکھیے کہ ناول ''نو لکھی کوٹھی'' میں اس کے والدین نے دیسی لوگوں یعنی ہندوستان کے لوگوں کے بارے میں اسے کیا کہا:

"حنا نے ایک نظر ولیم کی آنکھوں میں جھانکا اور بولی، ولیم میرا خیال ہے تمہیں کیتھی سے زیادہ ان کالوں کی فکر ہے۔ تم ان کے بارے میں حاکم بن کر کیوں نہیں سوچتے؟ خداوند یسوع مسیح نے تم پر ایک برکت نازل کر کے کمشنر بنا دیا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو وہ اپنی برکت واپس لے لے اور تم انہی کالوں کے ساتھ عذاب میں گرفتار ہو جاؤ کیوں کہ انھیں ایسی حالت میں ہم نے نہیں خداوند یسوع مسیح نے رکھا ہے۔ اب ان کو نہ یسوع مسیح جانتا ہے اور نہ یہ اسے جانتے ہیں۔ اس لیے ان سے دور رہو اور خدا کی برکتوں کو ضائع نہ کرو۔ جانسن صاحب تمہارے بارے میں بہت فکر مند ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے فیروز پور سے بھی ان کی رپورٹس اچھی نہیں آ رہیں اور یہ کہ ولیم گورنمنٹ سے زیادہ رعایا کا وفادار ہے۔ اس بات کے اثرات اس کی ملازمت پر بُرے پڑیں گے۔" 6

علی اکبر ناطق نے اس ناول میں تقسیم ہند سے پہلے کی ان تمام تلخ حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے جو آج قیام پاکستان کے اتنے سال گزر جانے کے باوجود ہمارے معاشرے میں بھی جوں کی توں چلی آ رہی ہیں۔ یہ ناول ہمارے عہد کے معاشرتی رویوں اور طبقاتی

تقسیم کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل کو بھی آشکارہ کرتا ہے اوران جرائم کی نشاندہی کرتا ہے جن کو ہمارے ملک کے لوگ عادتاً یا شوقیہ طور پر نہیں اپناتے بلکہ حالات انھیں اس قسم کے دھندوں میں ملوث کر دیتے ہیں۔

ہمارے معاشرے کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ یہاں امیر، امیر سے امیر تر اور غریب، غریب سے غریب تر ہی چلا آرہا ہے اور یہ معاشرتی مسئلہ اس وقت سے چلا آرہا ہے جب ہندو مسلم اکھٹے رہتے تھے۔ لہٰذا بعض لوگ تو غربت، جہالت اور پس ماندگی کی زندگی گزارتے گزارتے موت کی آغوش میں چلے جاتے اور یوں ہر طرح کے غموں سے نجات حاصل کر لیتے ہیں لیکن بہت سے افراد ایسے بھی ہیں جو ان حالات سے تنگ آکر اور اپنا معیار زندگی بلند کرنے اور آسائشات زندگی پانے کے لیے مختلف طرح کے جرائم میں مبتلا ہو کر انھیں ہی اپنا ذریعہ معاش بنا لیتے ہیں۔

اس ناول میں ایک اور حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ کہ معاشرے میں کوئی بھی جرم یا برا کام خود بخود جنم نہیں لیتا بلکہ اس کے پیچھے بہت سے محرکات ہوتے ہیں مثلاً مزدور کی مزدوری کی پوری رقم نہ ملنا، تعصب کا پھیلاؤ، وڈیروں و جاگیرداروں کی آپس کی دشمنیوں میں غریب کا استعمال اور سب سے بڑھ کر مزدور اور دیہاڑی دار طبقہ کی محنت و مشقت کے باعث فیکٹریوں، کارخانوں اور جاگیرداروں کا روز افزوں ترقی کا زینہ طے کرنا۔ یہ تمام وہ عوامل ہیں جو کسی بھی معاشرے میں جرائم کے فروغ کا سبب بنتے ہیں۔ ان ضمن میں ناول "نولکھی کوٹھی" کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> "کڑوا تمباکو ان کی مرغوب غذا تھی۔ آٹھوں پہر میں کوئی لمحہ ہو گا کہ ان کے بوڑھے۔ جوان حتیٰ کہ بچے بھی اس لعنت میں گرفتار نہ ہوں۔ تمباکو کے کثیف اور مسلسل دھویں سے ان کی مونچھیں اور داڑھیاں بھوری، زرد اور بدبودار ہو چکی تھیں اور وہ اسی ابکائی پیدا کر دینے والے رنگوں سے مانوس تھے۔ یہ لوگ نہایت سوکھے سڑے، لمبی مونچھوں، چھوٹی قامتوں، باریک آنکھوں اور چھوٹے چھوٹے پاؤں کے ساتھ دھوپ اگاتی سڑکوں پر آتے جاتے نظر آتے۔" [7]

ناول میں ہجرت کے مناظر اور مہاجرین کی کسمپرسی کے حالات کو بھی بیان کیا گیا کہ کس طرح مسلمان قافلے پیدل، بیل گاڑیوں، بسوں اور ٹرکوں کے ذریعے اپنے آبائی علاقے چھوڑ کر پاکستان کی جانب چلے جا رہے تھے جن میں عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی تعداد زیادہ تھی۔ مہاجروں کی کثیر تعداد سکھوں کے ہاتھوں اپنی جان گنوا بیٹھی تھی۔ اوپر سے بارش جو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی جس کی وجہ سے ہیڈ سلیمانکی کے دریا کا پاٹ اور پانی کی گہرائی اس قدر بڑھ گئی کہ جسے پار کرنا مشکل ہو گیا اور یوں وہاں رش اس قدر بڑھ گئی کہ تاحد نگاہ سر ہی سر نظر آتے تھے۔ دیگر وجوہات کے ساتھ ساتھ پل پار نہ کر سکنے کی ایک وجہ وہ گورکھا فورس بھی تھی جو پاکستان اور مسلمان مخالف تھی۔

صدیوں سے ایک ساتھ رہنے والے تقسیم ہند کا اعلان ہوتے ہی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن گئے اور ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اتنے وسیع پیمانے پر پھیلی کہ ہندوؤں کے ساتھ سکھ بھی ان کے وہاں رہنے کے خلاف ہو گئے۔ یوں

لگتا تھا کہ شاید مطالبہ پاکستان کے طرف دار لوگوں نے ہنگامی و وقتی وجوہات کی بنا پر ایک الگ وطن تو بنالیا لیکن فسادات اور نقل مکانی جیسے مسائل و مشکلات ان کی آنکھوں سے اوجھل ہی رہ گئے اور وہ یہ سوچنے سے قاصر رہے کہ مسلمان جو ہندوستان کے ایک وسیع رقبہ پر آباد ہیں اور تعداد میں بھی بہت زیادہ ہیں تو اتنی کثیر تعداد پر مشتمل آبادی کی ایک ساتھ منتقلی کیسے ممکن ہو گی۔

ہجرت کر کے آنے والوں کو سفری مشکلات تو پیش آئیں ہی مگر جب وہ ارض وطن پر پہنچے تو مہاجر کیمپوں میں قیام کے دوران جو اذیتیں انھیں برداشت کرنا پڑیں وہ جسمانی و روحانی دونوں طرح کی تھیں۔ کیمپوں میں ہونے والی بد نظمی بے ضابطگی، بھوک، افلاس اور بیماریوں نے اخلاقی مسائل بھی پیدا کیے۔

حالات نے پلٹا کھایا اور ہواؤں کا رخ تبدیل ہوا اور اس کام میں جان پہچان، رشوت، اثر و رسوخ اور سفارش شامل ہونے لگیں اور ایک ہی خاندان کے کئی کئی افراد کو مختلف جگہوں پر الاٹمنٹ کی جانے لگی۔ یہاں تک کہ بہت سے مقامی لوگوں کو بھی مہاجر قرار دے کر اور ان کی ملکیتوں کے جعلی کاغذات تیار کر کے ان کے ناموں پر بہت سی جائیدادیں منتقل کر دی گئیں اور جب فضل دین کو یہ سب نامناسب لگا تو تحصیل دار نے اسے سمجھایا کہ یہ سب تو خدا دے رہا ہے سو ہم کون ہوتے ہیں اس کے کاموں میں دخل اندازی کرنے والے اور یہ کہ اسے بھی ان سب کا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ فضل دین کو یہ بات ایسے سمجھ آئی کہ پھر کیا ہوا یا اس نے کیا کیا کِیا؟ اس ضمن میں ناول کا یہ اقتباس دیکھیے:

> "پھر تو اس کے ہاں بھی چند دنوں میں اللہ کا اتنا فضل ہو گیا کہ اسے اپنے مکان میں یہ فضل رکھنے کی بھی جگہ نہ بچی۔ مولوی فضل دین نے بھی اپنے، اپنی بیوی، ماں اور ساس کے نام پر کئی کئی الاٹمنٹوں کے کاغذات تیار کر کے مال روڈ پر ایک دکان، ماڈل ٹاؤن میں ایک کوٹھی، ریگل چوک میں ایک مکان، ایک آٹے کی مل شاہ عالمی میں الاٹ کرالی۔ اس کے علاوہ سوا ایکڑ زمین بھی ٹھوکر کے قریب ہی جی ٹی روڈ کے ساتھ رکھوالی۔ تحصیل دار نے تو فضل دین کو اور بھی کہا تھا۔ لیکن اس نے اتنے کو کافی سمجھا حالانکہ وہ جانتا تھا تحصیل دار گلزار محمد اور دوسرے افسر کیا کچھ کر رہے تھے۔ ان سب افسروں اور سیاستدانوں نے اپنے اور اپنے رشتے داروں کو چار پانچ نسلوں تک معاشی فکر سے آزاد کر دیا تھا۔" 8

ناول میں ہمارے معاشرے کی اس تلخ حقیقت سے بھی روشناس کرایا گیا ہے کہ یہ ملک ایسا ہے کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" یعنی جس کے پاس جتنی دولت اور اثر افیہ و مافیہ سے تعلقات ہوں گے وہ اتنا ہی فائدے میں رہے گا نیز یہ کہ بڑے لوگوں تک پہنچنے کے لیے ان کی بیویوں کو تحفے تحائف دینا اور ان سے تعلق بنانا بھی ضروری ہے تاکہ بوقت ضرورت انھیں بطور زینہ استعمال کیا جا سکے۔ اس کی مثال نوازالحق ہے جو مولانا فضل دین کا بیٹا اور مولوی کرامت کا پوتا تھا اور اپنے باپ دادا سے بھی چھ ہاتھ آگے نکلا۔ ترقی حاصل کرنے کے لیے بلاشبہ اس نے محنت بھی کی لیکن وہ اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے عہدے داروں کی دکھتی رگوں سے بھی واقف تھا اور ان کی بیویوں کی کمزوریوں سے بھی آگاہ تھا۔ یوں کہنا چاہیے کہ منافقت کی تمام ہی حدیں پھلانگ گیا جس

کا صلہ اسے یہ ملا کہ وہ دو سال کے اندر ہی تحصیل دار بن گیا جب کہ اس سے سینئر ویسے ہی بیٹھے رہے۔ ناول میں ضیا الحق دور کا احاطہ بھی کیا گیا ہے اور فوجی حکومت پر بھی گہرا طنز موجود ہے اور ساتھ ہی بھٹو کی پھانسی کا در پردہ ذکر بھی موجود ہے۔

فوجی نظام حکومت میں نوازالحق جیسے چاپلوس لوگ جو جنرل ضیاء الحق پر اپنی وفاداری اور سچے مسلمان ہونے کو ثابت کر پائے انھیں بہت سی مراعات بھی دی گئیں جیسا کہ نوازالحق نے جنرل صاحب کے قریبی لوگوں کے دروں پر دن رات حاضری کو اپنے اوپر نماز کی طرح فرض کر لیا اور اس پر جواباً یہ نظر عنایت ہوئی کہ 1982ء میں اسے اسسٹنٹ کمشنر بنا کر پورے پروٹوکول کے ساتھ جھنگ روانہ کر دیا گیا اور دوسری طرف ولیم جیسے ذمہ دار افسر کو اس کی وفاداری، خلوص اور کاموں کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا۔

یہ حقیقت بڑی تلخ ہے کہ ہم ایسے معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں جہاں سب چڑھتے سورج کے پجاری ہوتے ہیں۔ ناول میں ایسے لوگوں کو بھی آشکارہ کیا گیا ہے جو کسی بھی نئے افسر کی اپنے علاقے میں تعیناتی پر اس کی خوشامد اور اپنی پی آر بنانے کے لیے دوسروں کی جڑیں کاٹتے ہیں اور افسر بھی اپنی خوشامد اور تعریفوں پر پھولے نہیں سماتے اور یوں خوشامدی ٹولہ تیزی سے ترقی اور من پسند جگہوں پر تبدیلی کروالیتا ہے اور جو ایسا نہیں کرتا اس پر جھوٹے الزامات لگا کر دور دراز علاقوں میں ٹرانسفر کر دیا جاتا ہے۔ مصنف نے اس بات کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ افسروں کے پی اے سے تعلقات بہترین رکھے جائیں تو بھی انسان کے لیے کوئی مشکل پیش نہیں آتی جیسا کہ ناول میں حبیب اللہ کا کردار پیش کیا گیا ہے جو نوازالحق تک کسی کو بھی اس وقت تک نہیں پہنچنے دیتا جب تک اس کی مرضی نہ ہو۔

ہمارے ملک کا ایک بڑا المیہ یہ بھی ہے کہ انگریز تو بے شک یہاں سے چلے گئے لیکن اپنی شان و شوکت دکھانے اور اپنی حسرتوں اور عیاشیوں کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے جو بڑے بڑے مکانات، کوٹھیاں، بنگلے، کمپلیکس اور دیگر عمارات بنوائیں وہ آج بھی قائم ہیں اور لاکھوں ایکٹر کا رقبہ گھیرے ہوئے ہیں۔ جن میں آج ہمارے اعلیٰ افسر اور سیاستدان بڑی شان سے مزے کرتے ہیں۔

بنگلوں میں رہنے والوں کو غریبوں کے حالات زندگی کا کیا پتہ کہ جن کے پاس کھانے کو روٹی نہیں، پہننے کو کپڑے نہیں اور رہنے کو چھت میسر نہیں۔ اگر انگریزی دور کی ان بلند و بانگ عمارتوں کو غریبوں کے لیے گھروں میں تبدیل کر دیا جاتا تو شاید آج ہمارے ہاں بھی فکر معاش کے ساتھ ساتھ فکر رہائش نہ ہوتی اور بہت سے غریبوں کو سر چھپانے کی جگہ میسر آجاتی لیکن بد قسمتی سے یہاں تو سر ڈھانپنے والے کم اور سر ننگا کرنے والے زیادہ ہیں اور جنہیں پوچھنے والا کوئی نہیں۔

ناول کے آخری صفحات میں ولیم سے کی جانے والی ناانصافی کی صورت میں ملتی ہے کہ جس نے اس سرزمین کے لیے اپنا سب کچھ گنوا دیا لیکن یہاں کے نام نہاد امرا، سیاستدان اور افسران نے اس کی نو لکھی کوٹھی جو اسے جان سے بھی زیادہ عزیز تھی پہلے

کسی فوجی جنرل کو لیز پر دی اور ولیم کو اس کا کرایہ دار بننے پر مجبور کر دیا اور پھر مزید ظلم اس وقت ہوا کہ جب اس کوٹھی کی باقاعدہ الاٹمنٹ شمس الحق گیلانی نامی ایک رئیس کے نام پر کر دی گئی اور یہ کرنے والا کوئی اور نہیں بلکہ نوازالحق تھا جس کے باپ اور دادا پر ولیم کے بے شمار احسانات تھے لیکن ہمارے ملک کا یہ بھی ایک بڑا مسئلہ ہے کہ جو اچھا کرتا ہے اسی کے ساتھ برا کیا جاتا ہے۔ جب ولیم کو نو لکھی کوٹھی خالی کرنے کو کہا گیا تو اس بات نے اس کے دل و دماغ پر ایسی ضرب لگائی جو بالآخر اسے موت کی آغوش میں ہی پہنچا گئی۔

افسوس تو اس بات کا ہے کہ بے شک وہ نسلاً انگریز تھا لیکن ہماری حکومت نے اس کی محبت و وفا کو نہ سمجھا اور اس کے ساتھ نسلی امتیاز برتا۔ شاید کہ اگر وہ بھی ایک کرپٹ افسر ہوتا، بے ایمان، رشوت خور اور اشرافیہ و بیوروکریسی سے تعلقات بنا کر رکھنے والا ہوتا تو اسے نہ صرف پاکستانی شہریت دے دی جاتی بلکہ اسے اس کا عہدہ بھی واپس مل جاتا اور نو لکھی کوٹھی جو کہ اب ایک کھنڈر کا منظر پیش کرتی ہے کو بھی نہ چھینا جاتا۔

ناول کا اختتام ہمیں 1979ء کے زمانے میں لے جاتا ہے جب ولیم شدید سردی کے باعث نمونیہ کے مرض میں مبتلا ہونے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سو جاتا ہے۔ اس حوالے سے ناول اور ولیم دونوں ہی کا اختتام دردناک ہی نہیں بلکہ ناقابل فراموش بھی ہے۔ دیکھیئے ناول "نو لکھی کوٹھی" سے لیا گیا یہ اقتباس:

> "یہ انیس سو نواسی کی سردیوں کا زمانہ تھا اور ولیم کم و بیش اسی سال کا ہو چکا تھا۔۔۔ صحن کی ویرانی اور ہوا کی تیزی سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ولیم اندر بستر میں دبکا پڑا ہو گا۔۔۔ میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ دیکھا تو ولیم چارپائی پر سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ اس کے اوپر کمبل تھا، لیکن وہ اتنا گندہ اور بدبودار تھا کہ مجھے ہاتھ لگانے سے بھی کراہت ہوئی۔۔۔ یہاں ایک بوڑھا انگریز تھا وہ کہاں گیا؟ اس نے انتہائی لاپرواہی سے جواب دیا، کاکا اسے فوت ہوئے بھی ہفتہ ہو گیا۔ پنج چک کے عیسائی اسے اٹھا کر لے گئے۔ وہیں کے گرجاگھر میں اس کی قبر ہے۔" [9]

ناول نو لکھی کوٹھی کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ علی اکبر ناطق نے واقع ہی ایک شاہکار تخلیق کیا ہے تو بالکل غلط نہ ہو گا۔ یہ ناول نہ صرف اپنے موضوع کے اعتبار سے انفرادیت لیے ہوئے ہے بلکہ اس میں مصنف نے ان گنت معاشرتی مسائل کا احاطہ کیا ہے اور بعض ایسے حقائق کو پیش کیا ہے جن پر لکھنا ہر ایک ادیب کے بس کی بات نہیں۔

حوالہ جات

1. علی اکبر ناطق، "نو لکھی کوٹھی"، سانجھ پبلیکیشنز لاہور، 2019ء، ص۔6
2. ایضاً، ص۔21
3. ایضاً، ص۔49
4. ایضاً، ص۔111
5. ایضاً، ص۔155
6. ایضاً، ص۔203
7. ایضاً، ص۔241
8. ایضاً، ص۔389
9. ایضاً، ص۔432

References in Roman Script

1. Ali Akbar Natiq, Nau Lakhi Kothi, Sanjh Publishers, Lahore, 2019, p.6
2. Ibid, p. 21
3. Ibid, p. 49
4. Ibid, p. 111
5. Ibid, p. 155
6. Ibid, p. 203
7. Ibid, p. 241
8. Ibid, p. 289
9. Ibid, p. 432